جنا کی خوشبو سے ہوا معطّر تھی اور جھیل کے اس پار پیر مرد کی شکستہ جھونپڑی میں روشنی کی جھلک دکھائی دیتی تھی۔ میں نے سیدھا راستہ چھوڑ دیا اور جھیل کے کنارے کنارے کیچڑ میں پھنستا سڑک تک آپہنچا کس شان سے آیا تھا کس ہیئت کذائی سے جا رہا تھا؟ لیکن دل میں ایسا خوش تھا جیسے کوئی چڑیا پنجہ باز سے چھوٹ جائے۔

گو میں ایک مہینہ کے بعد لوٹا تھا۔ پر معلوم نہیں۔ کیوں نہ ابھی تک گھر کے آدمیوں کو اور نہ احباب کو میری فکر تھی۔ کمرہ میں ذرا بھی گرد و غبار نہ تھا۔ میں نے جب اپنے گھر پر اس واقعہ کا ذکر کیا تو لوگ خوب ہنسے اور احباب تو ابھی تک مسخر کیا کرتے ہیں۔ کہیں ایک لمحہ کے لیے بھی کمرہ سے باہر نہیں نکلا۔ ایک مہینہ غائب رہنے کا ذکر ہی کیا؟ اس وجہ سے اب مجھے بھی مجبوراً یہی کہنا پڑتا ہے کہ شاید میں نے کوئی خواب دیکھا ہو۔ بہر حال جو کچھ ہوا میں خدا کا ہزار ہا شکر کرتا ہوں کہ میں اس آزمائش سے بچ کر نکل آیا۔ مگر اس کے ساتھ مجھے اس آزمائش میں پڑنے کا افسوس نہیں ہے کیونکہ اس نے ہمیشہ کے لیے میری آنکھیں کھول دیں۔

دھوکا

ستی کُنڈ میں کھلے ہوئے کنول بسنت کے دھیمے دھیمے جھونکوں سے لہرا رہے تھے۔ صبح کی سکون بخش سنہری کرنیں ان سے گلے مِل مِل کر مسکراتی تھیں جس کے پھول وفا کے سنہرے رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔

راجکماری پربھا کنڈ کے کنارے ہری ہری گھاس پر کھڑی خوشنوا چڑیوں کے نغمے سن رہی تھی۔ اس کا کندنی رنگ انہیں پھولوں کی طرح دمک رہا تھا۔ صباحت کی ایک تصویر تھی۔ جو آفتاب کی زرّیں شعاعوں سے بنائی گئی تھی۔

پربھا نے مولسری کے درخت پر بیٹھی ہوئی ایک شیاما کی طرف دیکھ کر کہا۔

میرا جی چاہتا ہے کہ میں بھی ایسی ہی چڑیا ہوتی۔

اس کی سہیلی امبا نے مسکرا کر پوچھا "یہ کون؟"

پربھا نے کنڈ کی طرف تاکتے ہوئے جواب دیا۔ "پیڑ کی ہری بھری ڈالیوں پر بیٹھی ہوئی چہچہاتی۔ میری شیریں نوائیوں سے سارا باغ گونج اٹھتا۔"

امبا نے چھیڑ کر کہا۔ نوگڑھ کی رانی ایسی کتنی ہی چڑیوں کا گانا جب چاہے سن سکتی ہے۔

پربھا شرم سے سر جھکا کر بولی۔ مجھے نوگڑھ کی رانی بننے کی آرزو نہیں ہے میرے لیے کسی ندی کا سنسان کنارہ چاہیئے۔ ایک بین، اور دو سر سے خوشنوا پرندوں کی صحبت نغمۂ شیریں میں میرے لیے ساری دنیا کی نعمتیں بھری ہوئی ہیں۔

پربھا نے شاعرانہ مزاج پایا تھا۔ اور اکثر ایسے سپنے دیکھا کرتی تھی۔ امبا کچھ جواب دینا چاہتی تھی۔ کہ اتنے میں باہر سے کسی کے گانے کی آواز آئی۔

کر گئے تھوڑے دن کی پریت

پربھا نے ہمہ تن گوش ہو کر سنا۔ اور بیقرار ہو کر بولی، بہن اس آواز میں جادو ہے۔ مجھ سے اب بغیر سنے نہیں رہا جاتا۔ اسے اندر بلا لاؤ۔

امبا پر بھی نغمہ کا جادو اثر کر رہا تھا۔ بولی آج تک بے شک ایسا راگ میں نے نہیں سنا۔ کھڑکی کھول کر بلا لاتی ہوں۔

تھوڑی دیر میں راگیا اندر داخل ہوا۔ شکیل خوش قامت نوجوان تھا۔ برہنہ پا برہنہ سر کندھے پر ایک مرگ چھالا تھا۔ بدن پر گیروے رنگ کی کفنی، اور ہاتھوں میں ایک ستارہ، چہرہ سے نور برس رہا تھا۔ اس نے دبی ہوئی نگاہوں سے دونوں حسینوں کو دیکھا۔ اور تب سر جھکا کر بیٹھ گیا۔

پربھا نے بھی جھجکتی ہوئی آنکھوں سے دیکھا۔ اور نگاہیں نیچی ہو گئیں۔

امبا نے کہا، جوگی جی! ہمارے بڑے بھاگ تھے۔ کہ آپ کے درشن ہوئے۔ ہم کو بھی کوئی پد سنا کر کرتار تھ کیجیے۔ جوگی نے سر جھکا کر جواب دیا "ہم جوگی لوگ نرائن کا بھجن کرتے ہیں۔ ایسے ایسے دربارون میں ہم کیا گا سکتے ہیں۔ پر آپ کی مرجی ہے تو سنئے۔

کر گئے تھوڑے دن کی پریت

کہاں وہ پریت، کہاں وہ بچھڑون، کہاں دھورن کی ریت

کر گئے تھوڑے دن کی پریت

جوگی کی رسیلی اور پُر درد آواز، ستارہ کی زمزمہ سنجیاں، اس پر نغمہ کی لطافت پربھا کو بیخود کیے دیتی تھیں۔ اس نے بڑی دردرس طبیعت پائی تھی۔ اور اس کا ذوقِ نغمہ نہایت لطیف تھا جس طرح ستار کے زمزمے ہوا میں گونج رہے تھے اسی طرح پربھا کے دل میں شیریں تصورات کی ترنگیں اٹھ رہی تھیں۔ سوتے ہوئے جذبات کی نیندیں ٹوٹ گئیں۔ دل سرزمین خواب میں جا پہنچا۔ سنسنی کنڈ کے کنول طلسم کی پریاں بن بن کر منڈلاتے ہوئے بھونروں سے دست بستہ اور با چشم پر آب کہتی تھی۔

کر گئے تھوڑے دن کی پریت

سُرخ اور سبز پتیوں سے لدی ڈالیاں، حجاب سے سر جھکائے جھکتی ہوئی چڑیوں سے رو رو کہتی تھیں۔

کر گئے تھوڑے دن کی پریت

اور راجکماری پربھا کا دل بھی ستار کی مستانہ اداؤں کے ساتھ گونجتا تھا۔

کر گئے تھوڑے دن کی پریت

(۲)

پربھا بھگولی کے راؤ دیوی چند کی اکلوتی بیٹی تھی۔ راؤ صاحب پرانے وقتوں کے رئیس تھے۔ کرشن کی اپاسنا میں غرق رہتے جس کا ایک خاص جزو سماع ہے اس لیے اِن کے دربار میں دُور دُور سے کلاونت اور گویئے آیا کرتے۔ اور انعام واکرام پاتے۔ راؤ صاحب کو نغمہ سے عشق تھا خود بھی اس فن کے استادِ کامل تھے۔ اگرچہ اب پیرانہ سالی کے باعث کاوش کی طاقت باقی نہ تھی۔ پر اس فن کے رموز و نکات کے ماہر تھے۔ پربھا بچپنے ہی سے ان صحبتوں میں بیٹھنے لگی۔ اور کچھ طبعی مناسبت اور کچھ شب و روز کے چرچوں کے طفیل اسے بھی اس فن میں درخور ہو گیا تھا۔ اس وقت اس کے حسن کا شہرہ تھا۔ راؤ صاحب نے نوگڑھ کے جوان بخت اور نیک نہاد راجہ ہری چند سے اس کی شادی تجویز کی تھی۔ طرفین سے تیاریاں ہو رہی تھیں۔ راجہ ہری چند مُو کالج اجمیر کے متعلم تھے۔ اور نئی تہذیب کے دلدادہ، ان کی استدعا تھی۔ کہ انہیں ایک بار راجکماری پربھا سے بالمشافہ ہمکلام ہونے کا موقع دیا جائے۔ پر راؤ صاحب اس گناہِ عظیم کے مرتکب نہ ہو سکتے تھے۔

پربھا راجہ ہری چند کے نئے خیالات کے چرچے ہی اس تعلق سے بہت مطمئن نہ تھی۔ پر جس وقت اس نے اس باکمال اور نوجوان جوگی کا گانا سنا تھا۔ اس وقت سے وہ اسی کے دھیان میں ڈوبی رہتی۔ امبا اس کی سہیلی تھی۔ ان کے درمیان کوئی پردہ نہ تھا۔ پر اس راز کو پربھا نے اس سے بھی پوشیدہ رکھا۔

امیا اس کی مزاج شناس تھی۔ معاً تاڑ گئی۔ پر اس نے پند و نصیحت کر کے اس آگ کو بھڑکانا مناسب نہ سمجھا۔ اس نے خیال کیا کہ کس مپرسی کی حالت میں یہ وہم چند دنوں میں کافور ہو جائے گا۔ جیسا کہ اکثر سودائے خام کا انجام ہوتا ہے۔ مگر اس کا قیاس غلط ثابت ہوا۔ جوگی کی صورت کبھی پربھا کی آنکھوں سے نہ اترتی اسکا مدھر راگ ہردم اس کے کانوں میں گونجا کرتا۔ اسی کنڈ کے کنارے وہ از خود رفتگی کے عالم میں سارا دن بیٹھی رہتی۔ اور عالمِ خیال میں وہی مدھر دلکش راگ سنتی اور وہی نورانی صورت دیکھتی۔ کبھی کبھی اسے ایسا معلوم ہوتا کہ باہر سے وہ آواز آرہی ہے۔ وہ چونک پڑتی اور وحشت کے عالم میں باغ کی چاردیواری تک جاتی۔ وہاں سے مایوس ہو کر لوٹ آتی اور اپنے تئیں سمجھاتی۔ یہ کیسی حالت ہے؟ مجھے کیا ہو گیا ہے؟ میں ہندو لڑکی ہوں۔ والدین نے جسے سونپ دیں۔ اس کی لونڈی بن کر رہنا میرا دھرم ہے۔ مجھے دل و جان سے اس کی خدمت کرنی چاہیے۔ کسی دوسرے کا خیال بھی دل میں لانا میرے لیے پاپ ہے۔ آہ! دل میں پریم کا خیال رکھ کر میں کس منہ سے اپنے شوہر کے پاس جاؤں گی۔ ان کانوں سے کیونکر وہ محبت کی باتیں سنوں گی۔ جو میرے لیے طعنے سے بھی زیادہ تلخ ہوں گی؟ ان آنکھوں سے کیسے وہ محبت کی نگاہیں دیکھوں گی۔ جو نگاہِ قہر سے بھی زیادہ پُرسوز ہوں گی؟ اس گردن میں وہ محبت کے ہاتھ پڑیں گے۔ جو زنجیر سے بھی زیادہ گراں بار ہوں گے۔ پیارے! تم میرے دل سے نکل جاؤ۔ یہ جگہ تمہارے لائق نہیں۔ میرا بس ہوتا تو تمہیں دل کی سیج پر سلاتی۔ مگر میں دھرم کی رسیوں میں بندھی ہوئی ہوں۔

اس طرح ایک مہینہ گزر گیا۔ بیاہ کے دن نزدیک آتے جاتے تھے اور پربھا کا

کنول سا چہرہ مرجھا جاتا تھا۔ کبھی کبھی ان حسرت ناک خیالوں سے بے چین ہو کر اس کا جی چاہتا کہ کنڈ کی گود میں پناہ لوں۔ لیکن راؤ صاحب پر اس صدمۂ جانکاہ کے اثر کا خیال کر کے رک جاتی۔ اور سوچتی میں ان کا سرمایۂ زندگانی ہوں۔ مجھ بدنصیب کو انہوں نے کس نازونعمت سے پالا ہے۔ میں ہی ان کی زندگی کا سہارا، اور ان کی آخرت کی امید ہوں۔ نہیں یوں خیال دے کر میں ان کی آرزوؤں کا خون نہ کروں گی۔ میرے دل پر جو چاہے گزرے، انہیں نہ کڑھاؤں گی۔

بظاہر پربھا کا ایک گویّے جوگی کے پیچھے دیوانہ ہو جانا سبکسری معلوم ہوتی ہے اس کے نغمے تان سین کی تانوں سے بھی زیادہ دلربا کیوں نہ ہوں۔ پر ایک راجکماری کے لیے اس کے ہاتھوں بک جانا حد درجہ کی کمزوری کہی جا سکتی ہے۔ لیکن راؤ صاحب کے دربار میں علم کا، شجاعت کا، مردانہ جاں نثاریوں کا کوئی چرچا نہ تھا۔ جن سے حسن کی کلیاں کھلتی ہیں۔ وہاں تو شب و روز زمزمہ سنجیوں کے دور رہتے تھے۔ اس فن کے ماہر اعزاز کی مسند پر جلوہ افروز ہوتے تھے۔ اور انہیں پر تحسین کے بہترین جواہر لٹائے جاتے تھے۔ وہاں گانا ہی کمال کا معیار تھا۔ پربھا نے اوائل ہی سے یہی صحبتیں دیکھی تھیں۔ اور اس پر ان کا گاڑھا رنگ چڑھ گیا تھا۔ ایسی حالت میں اس کی طبیعت نے جو روش اختیار کی۔ اس پر تعجب کا کوئی مقام نہیں۔

(۳)

شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی۔ راؤ صاحب نے پربھا کو گلے سے لگا لیا اور رو رو کر رخصت کیا۔ پربھا بھی بہت روئی۔ اُمیا کو تو وہ کسی طرح چھوڑتی ہی نہ تھی۔

نوگڑھ بڑی ریاست تھی اور راجہ ہری چند کی خوش انتظامی کے باعث رونق پر تھی۔ پربھا کی خدمت کے لیے لونڈیوں کی ایک فوج تھی۔ اس کے لیے آئندبھون سجایا گیا تھا۔ جسے قدرت نے فضادی تھی، اور صنعت نے فرحت، مشاطہ نے دلہن کو خوب سنوارا۔ راجہ صاحب شوق دیدار سے بے چین تھے۔ اندر گئے۔ پربھا نے ہاتھ جوڑے ہوئے سر جھکا کر ان کا خیر مقدم کیا۔ مگر آنکھوں سے آنسو کی ندی بہہ رہی تھی۔ دولہا نے عاشقانہ جوش سے گھونگھٹ ہٹا دیا جس کا چراغ تھا، پر بے نور۔

دوسرے دن سے راجہ صاحب کی یہ کیفیت ہوئی کہ بھونرے کی طرح ہر دم اس پھول پر منڈلایا کرتے۔ نہ امور ملکی کی فکر تھی۔ نہ سیر و شکار کی پروا۔ پربھا کی باتیں نغمہ تھیں۔ اس کی نگاہیں ساغر، اور اس کے دیدار میں سیر کہسار کی دلاویزی تھی۔ محبت کے نشے میں بے خود ہوئے جاتے تھے۔ وہ کیا جانتے تھے کہ دودھ میں مکھی ہے۔

یہ غیر ممکن تھا کہ راجہ صاحب کی ان دلجوئیوں اور ناز برداریوں کا پربھا پر کوئی اثر نہ ہوتا اور ان سے اظہار تردد مقصود نہ تھا۔ اس میں سچا انوراگ بھرا ہوا تھا۔ جو ہم سے محبت کرتا ہے۔ اس سے ہم نفرت نہیں کر سکتے۔ پربھا دل میں نادم ہوتی وہ اپنے کو ایسی کامل خالص، محبت کے قابل نہ پاتی تھی۔ اس خلوص کے عوض میں اسے اپنے مصنوعی رنگے ہوئے جذبات ظاہر کرتے ہوئے روحانی صدمہ ہوتا تھا۔ جب تک کہ راجہ صاحب اس کے ساتھ رہتے، وہ انہیں اپنی شیریں ادائوں میں مخمور رکھتی۔ وہ ان کی گردن میں لتا کی طرح لپٹی ہوئی گھنٹوں پریم کی باتیں کیا کرتی۔ وہ ان کے ساتھ گلشن کی کیاریوں میں چہلیں کرتی۔ ان کے لیے پھولوں کے ہار گوندھتی۔ اور ان کے گلے میں ڈال کر کہتی، پیارے! دیکھنا یہ پھول مرجھا نہ جائیں۔ انہیں ہمیشہ

تازہ رکھنا۔ وہ چاندنی راتوں میں ان کے ساتھ کشتی پر بیٹھ کر جھیل کی سیر کرتی ۔ اور انہیں پریم کے راگ سناتی ۔ اگر انہیں باہر سے آنے میں ذرا بھی دیر ہو جاتی تو وہ پر مزہ شکوے کیا کرتی ۔ اور انہیں بے رحم اور بے درد کہتی ۔ ان کے سامنے خود ہنستی آنکھیں ہنستیں ، اور آنکھوں میں کاجل ہنستا تھا۔ مگر آہ! جب وہ اکیلی ہوتی تو طائر خیال اڑ کر اسی کنڈ کے کنارے جا پہنچتا۔ کنڈ کا وہ نیلگوں پانی اس پر تیرتے ہوئے کنول اور مولسریوں کی قطاریں آنکھوں کے سامنے آجاتیں پھر امبا مسکراتی ، نزاکت سے لچکتی آجاتی ۔ اور تب رسیلے جوگی کی دلفریب مستانہ تصویر آنکھوں میں آبیٹھی ۔ اور ستار کے نشہ خیز زمزموں کے ساتھ نغمہ جاں گداز کی صدائیں آنے لگتیں ۔

کر گئے تھوڑے دن کی پریت

تب وہ ایک سرد آہ کھینچ کر اٹھ بیٹھتی اور باہر نکل کر پنجرے میں چہکتی ہوئی چڑیوں کی شیریں نوائیوں میں پناہ لیتی ۔ اس طرح یہ خواب پریشان ہو جاتا ۔

(۴)

اسی طرح کئی مہینے گذر گئے۔ ایک روز راجہ ہری چند پرتھا کو اپنے نگارخانہ میں لے گئے جو استادان فن کی سحر طرازیوں کا بے نظیر مجموعہ تھا۔ طاق اوّل میں تاریخی تصاویر تھیں ۔ داخل ہوتے ہی رانا پرتاپ کی قد آدم تصویر نظر آئی جس کے چہرہ سے مردانہ سطوت کی شعاعیں نکل رہی تھیں ۔ ذرا آگے بڑھ کر دائیں طرف سرفروش سانگا، جانباز جیمل اور دلیر درگا داس جلوہ افروز تھے بائیں طرف غیور راجیت اور شیر دل بھیم سنگھ بیٹھے ہوئے تھے ۔ رانا پرتاپ کے مقابل سلیم،

لالہ ثابت قدم سیواجی کی تصویر تھی۔ طاق کے بالائی حصہ میں آمنے سامنے کامل کرشن اور روشن ضمیر رام براجتے تھے۔ مصوروں نے چہرہ نگاری میں کمال دکھایا تھا۔ باطن کو ظاہر بنا دیا تھا۔ پربھا نے پرتاپ کے پیروں کو چوما اور کرشن کے سامنے دیر تک آنکھوں میں احترام اور پریم کے آنسو بھرے سر جھکائے کھڑی رہی۔ اس کے دل پر اس وقت ایک تقدس آمیز رعب طاری تھا۔ اسے معلوم ہوتا تھا۔ یہ ان بزرگوں کی تصویریں نہیں۔ بلکہ ان کی پاک روحیں ہیں۔ جن کے کارناموں سے ہندوستان کی تاریخ روشن ہے۔ جو ہندوستان کا بہترین قومی سرمایہ، اعلیٰ ترین قومی یادگار اور بلند ترین قومی نعرے ہیں۔ وہ ان کے سامنے کھڑی نہ ہو سکی۔ اور جلدی سے طاق کے دوسرے حصہ میں داخل ہو گئی۔ یہاں وسط میں نورانی بڑھ یوگ آسن میں بیٹھے ہوئے نظر آئے۔ ان کے دائیں طرف عارف شنکر تھے اور بائیں طرف بیدار مغز دیانند ایک حصہ میں درویش کبیر اور صاحب دل رام داس پہلو بہ پہلو کھڑے تھے۔ ایک دیوار پر عالی مقام گوبند اپنے شہادت کے دونوں تاروں کے ساتھ جلوہ افروز تھے۔ دوسری دیوار پر ہندو فلسفہ کی بزم جاوداں قائم تھی۔ مصوروں کا کمال ایک ایک عضو سے ٹپکتا تھا۔ پربھا نے ان کے قدموں کو بوسہ دیا۔ پر ان کے سامنے سر نہ اٹھا سکی۔ اسے محسوس ہوتا تھا۔ کہ ان کی منور آنکھیں اس کے دل پر داغ میں چبھی جاتی ہیں۔

اس کے بعد طاق کا تیسرا درجہ آیا۔ شعرا رنازک خیال کی مجلس آراستہ تھی۔ روشن خیال والمیک اور ہمہ گیر ویاس جانے۔ صدر پر رونق افروز تھے۔ داہنے طرف رنگین بیان کالی داس تھے۔ بائیں طرف جدت طراز بھوبوتی۔ قریب ہی بھرتری اپنے گوشۂ قناعت میں بیٹھے ہوئے تھے۔ جانب راست معنی آفرین غالب اور انسانی فطرت

کے رمز شناس انیس تھے۔ جانب چپ پر سطوت ذوق، اور شیریں کلام آتش پُر گو نظیر، زمانہ شناس حالی، لطیف اکبر اور رفیق اقبال نے اس دائرہ کو پورا کر دیا تھا۔

دائیں طرف کی دیوار پر ہندی شعرا کا مجمع تھا۔ صوفی سور، فطرت نگار تلسی، قادرالکلام کیشو، اور عاشق تن بہاری، درجہ بدرجہ جلوہ افروز تھے۔ سُور داس سے پربھا کو روحانی عقیدت تھی۔ اس نے قریب جاکر ان کے قدموں کو بوسہ دینا چاہا۔ دفعتاً انہیں قدموں کے سامنے سر جھکائے اسے ایک چھوٹی سی تصویر نظر آئی۔ پربھا اسے دیکھ کر چونک پڑی۔ یہ وہی تصویر تھی۔ جو اس کے پردۂ دل پر کھنچی ہوئی تھی۔ وہ دو بدو اس کی طرف نگاہ نہ کر سکی۔ دبی ہوئی نگاہوں سے دیکھنے لگی۔

راجہ ہری چند نے مسکرا کر پوچھا۔ اس شخص کو کہیں تم نے دیکھا ہے؟

اس سوال سے پربھا کا دل کانپ اٹھا۔ جیسے ہرن شکاری کے سامنے راہِ فرار نہ پاکر گھبرایا ہوا۔ اِدھر اُدھر دیکھتا ہے۔ اسی طرح پربھا دیوار کی طرف تاکنے لگی۔ سوچنے لگی کیا جواب دوں؟ اس کو کہاں دیکھا ہے؟ انہوں نے یہ سوال مجھ سے کیوں پوچھا۔ کہیں تاڑ تو نہیں گئے؟ یا نارائن میری پت تمہارے ہاتھ ہے۔ کیونکر انکار کروں؟ چہرہ زرد ہو گیا۔ سر جھکا کر دبی ہوئی زبان سے بولی۔ ہاں خیال آتا ہے کہ کہیں دیکھا ہے؟

ہری چند، کہاں دیکھا؟

پربھا کے سر پر چکر سا آنے لگا۔ بولی شاید ایک بار وہ گاتا ہوا میرے باغ کے سامنے سے جا رہا تھا۔ امّاں نے بلا کر اس کا گانا سنا تھا۔

ہری چند نے پوچھا، کیسا گانا تھا؟

پربھا کے ہوش اڑے ہوئے تھے۔ سوچتی تھی۔ راجہ کا ایسی باتیں پوچھنا معنی سے خالی نہیں۔ دیکھوں آج لاج رہتی ہے۔ یا نہیں، بولی اس کا گانا تو ایسا برا نہ تھا۔

ہری چند نے شرارت آمیز انداز سے مسکرا کر پھر پوچھا، کیا گایا تھا؟

پربھا اس سوال پر باخبر ہو گئی۔ سوچی اس سوال کا سچا جواب دے دوں۔ تو پھر باقی کیا رہتا ہے۔ یقین ہو گیا۔ کہ آج خیریت نہیں ہے۔ چھت کی طرف دیکھ کر بولی، سورداس کا کوئی پد تھا۔

ہری چندر نے کہا۔ "یہ تو نہیں"۔

کر گئے تھوڑے دن کی پریت

پربھا کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ سر تیورانے لگا۔ کھڑی نہ رہ سکی۔ بیٹھ گئی اور مایوسانہ انداز سے بولی، ہاں یہی پد تھا۔ اور فوراً ہی کلیجہ مضبوط کر کے پوچھا، آپ کو کیسے معلوم ہے؟

ہری چندر بولے، وہ میرے یہاں اکثر آیا جایا کرتا ہے۔ مجھے بھی اس کا گانا پسند ہے اسی نے مجھ سے یہ حال بتایا تھا۔ مگر وہ تو کہتا تھا۔ کہ راجکماری نے میرے گانے کو بہت پسند کیا اور پھر آنے کے لیے اصرار کیا۔

پربھا کو اب سچا غصہ دکھانے کا موقع ملا۔ تیز ہو کر بولی، یہ بالکل جھوٹ ہے۔ میں نے اس سے کچھ نہیں کہا۔

ہری چند بولے۔ "وہ تو میں پہلے ہی سمجھ گیا تھا۔ کہ یہ حضرت کی چالاکی ہے۔ ڈینگ مارنا گویوں کا خاصہ ہے۔ مگر اس میں تو تمہیں انکار نہیں۔ کہ اس کا گانا برا نہ تھا"۔ پربھا خفیف ہو کر بولی۔ نہ! اچھی چیز کو برا کون کہے گا۔

ہری چند نے پوچھا، پھر سننا چاہو تو اسے بلواؤں۔ سر کے بل دوڑا آئے گا۔

کیا ان کے درشن پھر ہوں گے؟ اُمید ہے اس کا چہرہ شگفتہ ہوگیا۔ مگر ان کئی مہینوں کی متواتر کوشش سے جس خیال کو فراموش کرنے میں وہ کسی قدر کامیاب ہو چکی تھی۔ اس کے پھر تازہ ہو جانے کا خوف دامنگیر ہوا۔ بولی، میرا اس وقت گانا سننے کو جی نہیں چاہتا۔

ہری چند نے اصرار کیا۔ "یہ میں نہ مانوں گا، تم اور گانا سننا نہ چاہو۔ میں ابھی اُسے بلائے لاتا ہوں"۔

یہ کہہ کر راجہ ہری چند تیر کی طرح طاق سے باہر نکل آئے۔ پربھا انہیں روک نہ سکی۔ وہ دم بخود فکر میں ڈوبی کھڑی تھی۔ دل میں خوشی اور رنج کی لہریں باری باری سے اٹھتی تھیں۔ مشکل سے دس منٹ گزرے ہوں گے۔ اسی ستار کی مستانہ صداؤں کے ساتھ جوگی کی رسیلی تان سنائی دی۔

کر گئے تھوڑے دن کی پریت

وہی دل آویز نغمہ تھا، وہی جذباتی تاثیر، وہی روحانی دلکشی وہی سب کچھ جو فکر اور تخیل اور جذبات کو مرغزار تمنا میں پہنچا دیتا ہے۔

ایک لمحہ میں جوگی کی موہنی صورت دکھائی دی۔ وہی مستانہ پن، وہی نشیلی آنکھیں، وہی دیوتاؤں کی سی صورت، اس کے چہرہ پر ایک ہلکا سا تبسم تھا۔ پربھا نے اس کی طرف سہمی ہوئی نگاہوں سے دیکھا۔ دفعتاً اس کا کلیجہ اُچھل پڑا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے سے ایک پردہ سا ہٹ گیا۔ بے خودی کے نشہ سے اُمڈی ہوئی آنکھوں میں پریم کے آنسو بھرے۔ وہ اپنے شوہر کے پیروں پر گر پڑی اور بولی "پریتم"۔

راجہ ہری چند کو آج گرمی محبت، خلوص جذب، اور تسلیم کامل کا ایک نیا ولولہ انگیز اور سرور افزا تجربہ ہوا۔ وہ ناقابل اظہار کمی جو عالم خلوص میں بھی

کھٹکا کرتی تھی، دور ہوگئی تھی۔ انہوں نے پربھا کو سینے سے لگالیا۔ آج ان دونوں دلوں کے درمیان کوئی میل، کوئی حدِ فاصل، کوئی آڑ نہیں ہے۔ آج ان میں سچا ملاپ ہوا ہے۔

راجہ ہری چند نے کہا، "جانتی ہو میں نے یہ سوانگ کیوں رچا تھا؟ گانے کا مجھے ہمیشہ سے شوق ہے اور سنا کہ تمہیں بھی اس کا جنون ہے۔ تمہیں اپنا دلِ نظر کرنے سے پہلے ایک بار تمہارا درشن کرنا ضروری معلوم ہوا۔ اور اس کے لیے سب سے بہتر ترکیب یہی نظر آئی۔"

پربھا نے سرشار آنکھوں سے دیکھ کر کہا، "جوگی بن کر تم نے جو کچھ کیا پالیا۔ وہ راجہ رہ کر تم ہرگز نہ پاسکے۔ تم میرے پتی رہتے پرتیم نہ ہوسکتے۔ اب تم میرے پتی بھی ہو، اور پرتیم بھی۔ مگر تم نے مجھے بڑا دھوکا دیا۔ اور میری آتما کو کنہگار بنایا، اس کا ذمہ دار کون ہوگا؟"

سوت

پنڈت دیودت کی شادی ہوئے ایک زمانہ گزر گیا۔ مگر کوئی اولاد نہ ہوئی، جب تک ان کے ماں باپ زندہ تھے۔ وہ ان سے ہمیشہ دوسری شادی کرنے کے لیے تقاضا اور اصرار کرتے رہے۔ مگر پنڈت جی کبھی اس پر راضی نہ ہوئے۔ انہیں اپنی بیوی گودا دری سے سچی محبت تھی۔ اور اولاد کی آرزو میں وہ اپنی موجودہ عافیت - اور اطمینان کو خیرباد نہیں کہنا چاہتے تھے۔ اس کے علاوہ وہ کچھ نئے خیالات کے آدمی تھے۔ اور ان ذمہ داریوں کو سمجھتے تھے۔ جو اولاد اپنے ساتھ لاتی ہے۔ جب تک انسان میں اتنی مقدرت نہ ہو کہ وہ اپنی اولاد کی کماحقہ پرورش، تعلیم اور تربیت کا کفیل ہو سکے۔ اسے شادی سے مجتنب رہنا چاہیے۔ اسے وہ خوب سمجھتے تھے۔ پہلے پہلے تو کبھی کبھی بچوں کو ہنستے کھیلتے دیکھ کر ان کے جگر پر ایک چوٹ سی لگتی تھی۔

مگر اب اپنے دیگر ہم وطنوں کی طرح وہ بھی جسمانی عوارض میں مبتلا رہتے تھے۔ اور اولاد کا خیال کرتے ہی انہیں ایک خوف سا معلوم ہوتا تھا۔ لیکن گوداوری اتنی جلدی مایوس ہونے والی نہ تھی۔ پہلے تو وہ دیوی، دیوتا، گنڈے تعویذ اور جنتر منتر پر معتقد رہی۔ مگر جب اس نے دیکھا۔ کہ ان سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ تو اس نے پنڈت جی کی دوسری شادی کرنے کا منصوبہ کیا۔ اس نے ہفتوں مہینوں اس فکر میں کاٹے۔ دل کو بہت سمجھایا۔ مگر جو بات من میں سما گئی تھی۔ وہ کسی طرح نہ نکلی۔ ہاں اسے بڑی زبردست قربانی کرنا پڑے گی۔ شاید شوہر کی محبت کا انمول رتن بھی اس کے ہاتھ سے نکل جائے۔ پر کیا ایسا ہو سکتا ہے؟ پندرہ سال تک لگاتار جس نخلِ محبت کو پالا۔ اور سینچا۔ کیا وہ ہوا کا ایک جھونکا بھی نہ سہہ سکے گا۔

گوداوری نے آخر کار اولاد کی پرزور خواہش کے سامنے سر جھکا دیا۔ اور سوت کا خیر مقدم کرنے کے لیے تیار ہو گئی۔

۲

پنڈت دیودت، گوداوری کی یہ تجویز سنتے ہی ہنس پڑے۔ انہوں نے قیاس کیا کہ یا تو میری محبت کا امتحان لیا جا رہا ہے۔ یا میرا من لینے کی کوشش ہے۔ ہنس کر بات ٹال دی۔ مگر جب گوداوری نے متین انداز سے کہا "تم اسے ہنسی مت سمجھو۔ میں سچے دل سے کہتی ہوں۔ کہ اولاد کا منہ دیکھنے کے لیے میں سوت سے چھاتی پر مونگ دلوانے کے لیے بھی تیار ہوں۔ یہ کہتے کہتے اس کی آنکھیں پُرآب ہو گئیں۔ تب تو پنڈت جی کو کوئی شبہ نہ رہا۔ اتنے اعلیٰ اور بے نفس ارادے

سے بھری ہوئی گوداوری کو انہوں نے گلے سے لگالیا اور بولے "مجھ سے یہ نہ ہوگا۔ مجھے اولاد کی آرزو نہیں" گوداوری نے زور دے کر کہا "تم کو نہیں مجھے تو ہے اگر اپنی خاطر سے نہیں تو میری خاطر سے یہ کام کرنا پڑے گا"۔

پنڈت جی سیدھے سادے آدمی تھے۔ حامی تو نہ بھری مگر کچھ نیم راضی سے ہو گئے۔ بس اس کی دیر تھی۔ پنڈت جی کو ذرا بھی تکلیف نہ کرنا پڑی۔ گوداوری کی دانشمندی نے ساری منزل آسان کر دی۔ اس نے صرف اپنے پاس سے روپے ہی نہیں نکالے۔ بلکہ اپنے گہنے کپڑے بھی نذر کر دیئے۔ بدنامی کا خوف اس راستہ میں ایک بڑا زبردست کانٹا تھا۔ دیودت جی یہ سوچتے کہ جب میں سر پر مور سجا کر مونچھیں کٹوائے۔ دولہا بنا ہوا نکلوں گا۔ تو لوگ مجھے کیا کہیں گے۔ میرے دفتر کے لوگ مضحکہ اڑائیں گے۔ اور میری طرف مسکراتی ہوئی نگاہوں سے دیکھیں گے۔ ان کی یہ نگاہیں چھرے سے بھی زیادہ تیز ہوں گی۔ اس وقت کہاں منہ چھپاؤں گا؟ مگر گوداوری نے اپنے گاؤں میں جا کر اس کام کو چھیڑا۔ اور بخیریت انجام تک پہنچا دیا۔ نئی بہو گھر میں آگئی۔ اس وقت گوداوری ایسی خوش تھی۔ گویا بیٹے کا بیاہ کر لائی ہے وہ خوب گاتی بجاتی رہی۔ اسے کیا معلوم تھا۔ کہ بہت جلد اس گانے کے بدلے رونا پڑے گا۔

۳

کئی مہینے گزر گئے۔ گوداوری اپنی سوت پر اسی طرح حکومت کرتی تھی۔ گویا وہ اس کی ساس ہے۔ تاہم اسے یہ بات اک دم کے لیے نہ بھولتی تھی۔ کہ میں اصل میں اس کی ساس نہیں ہوں۔ اُدھر گھومتی کو بھی اپنی حیثیت کا پورا خیال رہتا تھا۔ اسی لیے گوداوری کی حکومت، ساس کی حکومت کی طرح سخت نہ ہونے کے باوجود

اسے ناقابل برداشت معلوم ہوتی۔ اسے اپنی چھوٹی موٹی ضرورتوں کے لیے بھی گوداوری کے سامنے ہاتھ پھیلاتے شرم آتی تھی۔

کچھ دنوں بعد گوداوری کی عادات میں ایک نمایاں فرق نظر آنے لگا۔ وہ پنڈت دیودت کو گھر میں آتے جاتے بڑی تیز متجسس نگاہوں سے دیکھتی۔ اس کی فطری متانت غائب سی ہوگئی۔ ذرا سی بات بھی اس کے پیٹ میں نہیں پچتی جب پنڈت جی دفتر سے آتے ہیں۔ تب گوداوری گھنٹوں ان کے پاس بیٹھی ہوئی گومتی کا ذکرِ خیر کیا کرتی ہے۔ اس داستان میں اکثر ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں کا ذکر ہوتا ہے کہ جب وہ ختم ہو جاتی ہیں۔ تو پنڈت جی کے دل پر سے ایک بوجھ سا اتر جاتا ہے۔ گوداوری کیوں اتنی پر گو ہوگئی تھی۔ اس کا راز سمجھنا مشکل ہے۔ شاید وہ اب گومتی سے ڈرتی تھی۔ ان کے حسن سے، اس کے شباب سے اور اس کی شرمیلی آنکھوں سے، باندھ کر توڑ کر وہ اب پانی کا بہاؤ مٹی کے ڈھیلوں سے روکنا چاہتی ہے۔

ایک دن گوداوری نے گومتی سے میٹھے چاول پکانے کو کہا۔ شاید رکھشا بندھن تھا۔ گومتی نے کہا شکر نہیں ہے۔ گوداوری یہ سن کر متحیر ہوگئی۔ اتنی شکر اتنی جلد کیسے اٹھ گئی۔ جسے چھاتی پھاڑ کر کمانا پڑتا ہے۔ اسے اکھرتا ہے۔ کھانے والے کیا جانیں؟

جب پنڈت جی دفتر سے آئے تو یہ ذرا سی بات ایک طولانی داستان بن کر ان کے کانوں میں پہنچی۔ تھوڑی دیر کے لیے پنڈت جی کو شبہ ہوا۔ کہ کہیں گومتی کو غلبہ اشتہا کا مرض تو نہیں ہوگیا۔

ایسا ہی واقعہ ایک بار پھر ہوا۔ پنڈت جی کو بواسیر کی شکایت تھی۔ لال

مرچ بالکل نہ کھاتے تھے۔ گودا وری جب کھانا پکاتی تو اس بات کا بڑا خیال رکھتی تھی۔ گومتی نے ایک دن مصالحہ کے ساتھ دال میں تھوڑی سی لال مرچ بھی ڈال دی پنڈت جی نے دال کم کھائی۔ مگر گودا وری گومتی کے پیچھے پڑ گئی۔ اینٹھ کر اس سے بولی۔ "ایسی زبان جل کیوں نہیں جاتی۔

(۴)

پنڈت جی سیدھے سادے آدمی تھے ہی، دفتر سے آئے، کھانا کھایا، پڑ کر سو رہے۔ وہ ایک ہفتہ وار اخبار منگواتے تھے۔ مگر اسے کبھی کبھی مہینوں کھولنے کی نوبت نہ آئی تھی۔ جس کام میں ذرا بھی تکلیف یا تردد ہو۔ اس سے وہ کوسوں دور بھاگتے تھے۔ کبھی کبھی ان کے دفتر میں تھیٹر کے پاس مفت ملا کرتے تھے۔ مگر پنڈت جی ان سے کبھی کام نہ لیتے۔ اور ہی لوگ مانگ لے جاتے تھے۔ رام لیلا یا اور کوئی میلا تو شاید نوکری کرنے کے بعد کبھی دیکھا ہی نہیں۔ گودا وری ان کی عادت سے واقف ہو گئی تھی۔ پنڈت جی بھی ہر ایک معاملہ میں اسی کی رائے پر چلنے میں اپنی عافیت سمجھتے تھے۔

پر روئی جیسی ملائم شے بھی دب کر سخت ہو جاتی ہے۔ پنڈت جی کو یہ آٹھوں پہر کی دیکھ بھال سخت ناگوار معلوم ہوتی۔ کبھی کبھی وہ من ہی میں جھنجھلانے بھی لگتے۔ قوت ارادی جو عرصۂ دراز تک بے کار پڑے رہنے سے بالکل مردہ ہو گئی تھی۔ از سر نو عود کرنے لگی۔

پنڈت جی یہ مانتے تھے۔ کہ گودا وری نے سوت کو گھر لانے میں بڑے ایثار سے کام لیا۔ اس ایثار کو بشریت سے کوئی مناسبت نہیں۔ لیکن اس کا جو احسان

ہے ، مجھ پر ہے ۔ گومتی پر اس کا کیا احسان ؟ میرے باعث اس سے کیوں اس بے دردی کا برتاؤ کیا جاتا ہے ؟ یہاں اسے ایسا کون سا سکھ مل گیا ہے جس کے بدلے میں وہ یہ پھٹکاریں سہے ، شوہر ملا ہے ، وہ بوڑھا ، دائم المرض گھر ملا ہے ۔ وہ ایسا کہ آج نوکری چھوٹ جائے تو کل نان شبینہ کا بھی ٹھکانا نہیں ۔ ان حالات میں ۔ گوداوری کا ظالمانہ سلوک انہیں بہت ناگوار معلوم ہوتا ۔

گوداوری کی آنکھیں اتنی کم بین نہ تھیں کہ پنڈت دیودت کی کیفیات قلب نظر نہ آئیں ۔ ان کے دل میں جو خیالات پیدا ہوتے وہ گوداوری کو ان کے چہرہ پر موٹے حروف میں منقوش معلوم ہوتے ۔ یہ علم اس کے سینے میں ایک طرف تو گومتی کے خلاف حسد کی آگ بھڑکاتا تھا ۔ اور دوسری طرف پنڈت جی پر خود غرضی ، بے وفائی اور دغابازی کا الزام عائد کرتا تھا ۔ نتیجہ یہ ہوا ، کہ دل کی کدورت روز بروز بڑھتی ہی گئی ۔

(۵)

رفتہ رفتہ گوداوری نے پنڈت جی سے گومتی کا چرچا کرنا ہی چھوڑ دیا ۔ گویا اس کے نزدیک گومتی گھر میں تھی ہی نہیں ۔ وہ اب نہ اس کے کھانے پینے کی خبر لیتی ہے ۔ نہ کپڑے لتے کی ، ایک بار کئی دنوں تک اسے اپنے ناشتہ کرنے کو بھی نہ ملا ۔ پنڈت جی آرام طلب آدمی تو تھے ہی وہ ان سب بے عنوانیوں کو دیکھتے مگر اپنی عافیت کے سمندر میں تلاطم پیدا ہونے کے خوف سے زبان نہ ہلاتے تھے ۔ تاہم یہ آخری بے رحمی ان کے غیر معمولی تحمل و برداشت کے لیے بھی قاتل ثابت ہوئی ۔ ایک دن انہوں نے گوداوری سے ڈرتے ڈرتے کہا : "کیا آج کل گھر میں ناشتہ کے